بینکنگ اور انشورنس

BANKING AND INSURANCE

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بینکنگ اور انشورنس

جناب صدر اور محترم حاضرین! موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو اپنی زندگی کے ہر گوشے میں اس پیچیدگی سے واسطہ پڑ رہا ہے کہ جن اصولوں کے وہ صدیوں سے قائل ہیں۔ اپنے دین کے جن احکام کے وہ معتقد ہیں اور ان احکام کا جو سیدھا اور صاف مفہوم ان کو معلوم ہے دنیا کی گاڑی ان کے خلاف چل رہی ہے۔ مسلمان ہر جگہ اور زندگی کے ہر گوشے میں یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اپنے اصولوں پر قائم رہیں تو دنیا کی اس گاڑی میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں اور دنیا کی اس گاڑی کے ساتھ چلتے ہیں تو اپنے اصولوں پر قائم رہنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور یہ فی الحقیقت ایک سزا ہے ایک مدتِ دراز تک خوابِ خرگوش میں سوتے رہنے کی اور اس بات کی کہ صدیوں سے ہم نے معاملاتِ دنیا کو ترقی کے خطوط پر نہیں چلایا۔ اس دوران میں دوسرے لوگوں نے اپنے نظریات اور اپنے اصولوں کے مطابق دنیا کو اپنے مخصوص طریقوں پر چلایا اور ہماری جب آنکھ کھلی تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے لیے اس گاڑی کے ساتھ چلنا اور اپنے اصولوں پر قائم رہنا بیک وقت ممکن نہیں۔ یہی پیچیدگی ہے جو ہمیں زندگی کے ہر گوشے میں پیش آتی ہے۔ اور جب سے یہ

پیچیدگی پیدا ہوئی ہے بالعموم تین قسم کے طرز ہائے عمل اختیار کیے گئے اور کیے جا رہے ہیں۔

پہلا یہ کہ اسلام کے اصولوں کو ہی بدل ڈالا جائے۔ احکام کی صاف نفی کر دی جائے اور اگر نفی نہ کی جائے تو کہہ دیا جائے کہ ان کے وہ معنی نہیں جو صدہا برس سے چلے آتے ہیں اور یہ کہ اہلِ مغرب نے زندگی کو جن اصولوں پر قائم کر دیا وہی اسلامی ہیں۔

چنانچہ ثقافت ہی کے معاملے کو لے لیجیے، دنیا کے گوشے گوشے میں یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس کے معاملے میں مغرب کے اصولوں کو اپنا لیا جائے۔ اہلِ علم کا اچھا خاصا گروہ اس کام میں مشغول ہے کہ مغرب کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام قرار دے دیا جائے۔

دوسرا طرز عمل یہ اختیار کیا گیا کہ جو چیزیں اسلام کے اصولوں کے خلاف ہیں انھیں کہا تو خلافِ اسلام ہی جائے لیکن اضطرار کی بنا پر عملاً قبول کر لیا جائے۔ اس میں عجیب خرابی یہ ہے کہ اضطرار جس کی بنیاد پر بعض چیزوں کی اجازت دی گئی ہے محدود اور افراد کے لیے ہے۔ لیکن اسے ایک پوری قوم کی قوم، ایک امت کی امت مستقل طور پر اپنا کر مضطر ہو جائے تو یہ اضطرار کے مفہوم سے بالکل بعید ہے۔ پھر ایک خرابی یہ ہے کہ اضطرار کو مستقلاً اپنانے سے رفتہ رفتہ دینی اور اخلاقی حس ختم ہوتی چلی جائے گی۔ اطمینانِ قلب نہ رہے گا۔ کیونکہ ایک طرف یہ علم ہو گا کہ یہ چیز حرام ہے اور دوسری طرف یہ احساس کہ حرمت کے باوجود ہم اس میں ملوث ہیں اور ظاہر ہے کہ اس پریشان خیالی اور دو رنگی کے ساتھ ہم ان قوموں سے مقابلہ نہیں کر سکیں گے جو ہر معاملے میں یکسو ہیں۔

تیسرا طرز عمل اہلِ علم اور دیانتدار لوگوں کا ہے وہ احکامِ الٰہی

صاف صاف بیان کر دیتے ہیں ، صاف کہہ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں چیزیں حرام ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک چیز کو حرام بتا دینا کافی نہیں ، جب تک اس کا بدل نہ بتایا جائے ۔ ایسا بدل جس سے کاروبارِ زیست چلتا رہے اور چلتی ہوئی بات کو حرام کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ہاتھ رکوا دیے جائیں اور یوں ہماری گاڑی زیادہ دیر چلتی نہ رہ سکے گی ۔

ان طرز ہائے عمل کی موجودگی نے اب تک ہماری پیچیدگیوں میں کوئی کمی نہیں کی ۔ اس لیے کہ ضرورت ایک چوتھے طرزِ عمل کی ہے جو یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کو ٹھیک ٹھیک مان کر اپنے معاملات پر ٹھیک ٹھیک انطباق کیا جائے لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا جائے کہ ایک غلط کام کو ترک کر کے کونسا درست کام اختیار کیا جائے گا جو قابلِ عمل بھی ہو اور ہمیں اس قابل بھی بنائے کہ ہم دنیا کی رہنمائی کر سکیں اور دنیا کے غلط طریقوں کو بدلنے کا کام کامیابی سے کر سکیں ۔

میں کوشش کروں گا کہ ان پیچیدگیوں میں سے ایک پیچیدگی بینکنگ اور انشورنس کو لے کر اسی آخری طرزِ عمل کے مطابق اس سے بحث کروں ۔

بینکنگ اور انشورنس

یہ دونوں چیزیں ہمارے نظامِ معیشت میں اس طرح پیوست ہیں اور پوری دنیا کے مالی ، تجارتی ، حکومتی ، قومی اور شخصی معاملات میں اس حد تک دخیل ہیں کہ ان پر غور کرنا بڑی بڑی پیچیدگیوں کو دعوت دینے کے مترادف ہے ۔ لیکن اس کے باوجود ان پر سوچ بچار کیا جا رہا ہے اور یہ اجتماع اس بات پر شاہد ہے کہ لوگوں کو ان کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر معلوم کرنے اور ایک قابلِ عمل طریقۂ کار کی جستجو ہے ۔ لوگ ان کی برائیوں سے واقف ہیں لیکن اپنے سامنے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتے ۔

میں اس سلسلے میں اپنے نتائجِ فکر تین اجزا میں بیان کروں گا۔

(۱) بینکنگ اور انشورنس کے نظام کی اسلامی نقطۂ نظر سے تشریح۔ اور یہ کہ ان میں قباحتیں کیا ہیں۔

(۲) اس سلسلے میں اسلامی احکام کی وضاحت۔ اور

(۳) ان دونوں کو اگر اسلامی اصولوں پر استوار کیا جائے تو کیا شکل اختیار کی جائے گی۔

بینکنگ کیا ہے؟

جہاں تک بینکنگ کا تعلق ہے اس اجتماع میں ایسا کوئی شخص نہ ہوگا جو یہ نہ جانتا ہو کہ ایک ایسے ادارے کا وجود کتنا ضروری ہے جو صنعت و تجارت کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کا انتظام کرے اور بوقتِ ضرورت حکومت کو بھی روپیہ دے۔ یہی بات انشورنس کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے ایک ایسے ادارے کی موجودگی لازمی ہے جو اچانک نقصانات کی تلافی کر کے افراد اور اداروں کو اپنا کاروبار جاری رکھنے کے قابل بنائے۔ یعنی اگر حقیقت کو دیکھا جائے تو یہ دونوں چیزیں انسانی ضروریات میں شامل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بینکنگ کے نظام کا سراغ حضرت مسیح علیہ السلام سے دو ہزار برس پہلے کے زمانے میں ملتا ہے اور انشورنس کے بارے میں بھی ثبوت ملتا ہے کہ ازمنہ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ لیکن اگر انسان خدا اور اس کے رسولوں کی رہنمائی اختیار کیے بغیر اپنی خواہشات کے مطابق ضروریات کو پورا کرلے تو صحیح مقاصد کے لیے بھی غلط طریقے استعمال کرتا ہے اور یہی صورت بینکنگ اور انشورنس کیساتھ پیش آئی ہے۔

بینکنگ کی جو شکل اس وقت دنیا میں رائج ہے وہ یہ ہے کہ کچھ لوگ جو مالی معاملات میں بصیرت رکھتے ہیں لوگوں کو اپنی بچتیں منفرد جگہوں میں لگانے کا موقع نہیں دیتے بلکہ سود کا لالچ دے کر اور اس بات کا یقین دلا کر کہ یہ مقرر منافع انھیں بہرصورت

اور لازماً ملے گا، ان کی پونجیوں کو جمع کر لیتے ہیں اور پھر جب یہ مالی قوت جمع ہو جاتی ہے تو اسے اپنی شرائط پر اور سود کی نئی شرح پر صنعت و تجارت کو بطور قرض دے دیتے ہیں بغیر اس کے کہ نقصان میں شریک ہوں یا خطرہ مول لیں ایک مقررہ منافع کی ضمانت لے لیتے ہیں ۔ یعنی وہ ان شعبوں میں شریک بن کر نہیں جاتے، بلکہ قوم کی بچت کو سود پر جمع کر کے آگے سود پر چلا دیتے ہیں ۔

انشورنس کی حقیقت

دوسری ٹانگ جس پر یہ سرمایہ دارانہ نظام کھڑا ہے ۔ انشورنس ہے ۔ یہاں شکل یہ ہے کہ کچھ لوگ اس بات کی ضمانت دے کر کہ نقصان ہوا تو تلافی کر دی جائے گی قوم کے ہر طبقے سے بطور پریمیم روپیہ لے کر جمع کرتے اور پھر سود پر اسے آگے چلاتے ہیں ۔ پھر چونکہ فرد اور کمپنی کے درمیان انشورنس درحقیقت قمار کا معاملہ ہے ۔ لہٰذا صورت واقعہ یہ ہے کہ اس کی ابتداء قمار سے ہوتی ہے اور انتہا سود پر انشورنس کمپنی فرد سے معاہدہ کرتی ہے کہ اگر فلاں حادثہ پیش آیا تو اسے اتنی رقم ادا کر دی جائے گی جتنی کمپنی کو وصول بھی نہیں ہوئی اور معاملے کی یہ شکل خالص قمار ہے اس سلسلے میں بعض عدالتوں کے فیصلے قمار کی تعریف اور انشورنس اور قمار کے تعلق پر خوب روشنی ڈالتے ہیں۔

مقدمہ تھیکر بنام ہارڈی میں لارڈ جسٹس کاٹن کہتا ہے :

"جوئے کی حقیقت یہ ہے کہ ایک فریق کی جیت اور دوسرے فریق کی ہار مستقبل میں ہونے والے ایک ایسے واقعے پر مبنی ہو کہ جو معاہدے کے وقت بالکل غیر یقینی نوعیت رکھتا ہو ۔ قانون ایک معاہدے کو ایسی حالت میں ناپسند کرتا ہے جب اس کی تکمیل یا اس پر عمل درآمد کو سراسر بخت و اتفاق پر چھوڑ دیا گیا ہو ۔ انشورنس کے معاہدے میں بھی غیر یقینیت کا یہ عنصر بہت بڑی حد تک شامل ہے اگرچہ ایک شخص کی موت یقینی ہے ۔ مگر یہ بات کہ وہ ٹھیک کس وقت مرے گا ۔ غیر یقینی ہے اور اس بات پر

لائف انشورنس کی ایک پالیسی، ہوسکتا ہے کہ دو قسطوں کی ادائے گی پر قابلِ وصول ہوجائے اور ہوسکتا ہے کہ بیس قسطوں کی ادائے گی پر ہو۔ اسی طرح یہ امر بھی یقینی نہیں ہے کہ ایک آتش زنی کا واقعہ یا ایک حادثہ رونما ہوگا یا نہیں جس کی بنا پر ایک شخص کمپنی سے تلافی کے مطالبے کا حقدار ہو۔"

مقدمہ سالٹ بنام نارتھیمپٹن میں لارڈ بریمول لکھتا ہے :۔

"ہر بیمۂ زندگی ایک قسم کی جوئے کی شرط ہے۔ میں ۲۰ پونڈ سالانہ کی بازی جیتے جی اس امید پر لگاتا ہوں کہ اگر میری موت کا واقعہ پیش آگیا تو کچھ لوگوں کو ایک ہزار پونڈ ملیں گے اگر میں جلدی مرجاؤں تو جیت گیا اور دیر میں مروں تو ہار گیا۔"

جسٹس فولٹن ایک مقدمے کے فیصلے میں لکھتا ہے :۔

"بلا لحاظ اس کے اس بات کی کوئی سند ہے یا نہیں۔ بظاہر یہ کہنا سخت مشکل ہے کہ آخر اصولاً کیا فرق ہے۔ اس معاہدے میں کہ الف سالانہ ایک رقم ب کو اس شرط پر دیتا رہے گا کہ ایک مدت خاص کے اندر الف کی موت واقع ہوجانے کی صورت میں ب ایک بڑی رقم ادا کرے گا اور اس معاہدے میں کہ ایک چھوٹی سی رقم اس شرط پر دی جائے کہ ایک خاص گھوڑا اگر دوسرے گھوڑوں سے آگے نکل گیا تو دوسرا فریق ایک بڑی رقم ادا کرے گا۔"

انشورنس کی اصولی نوعیت محولا بالا عدالتی فیصلوں کی موجودگی میں بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ لیکن ہندوستان اور یورپ کی بعض عدالتوں نے انشورنس اور جوئے میں فرق پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے، ان کے نزدیک فرق کی بنیاد یہ ہے کہ :۔

"اگر کسی جان یا مال میں دلچسپی معقول وجوہ کی بنا پر رکھی جائے تو یہ انشورنس کا معاملہ ہے۔ لیکن اگر غیر معقول وجوہ کی بنیاد پر ہو تو یہ جُوا ہے۔"

یہ فرق بہت نازک ہے اور لطیف ہے بلکہ ناقابلِ فہم بھی۔ ورنہ معاملے کی اصولی نوعیت یہی ہے کہ انشورنس میں ایک شخص کا نفع یا ایک شخص سے دوسرے کو مال کا منتقل ہونا اتنا ہی اتفاقی ہوتا ہے جتنا جوئے میں ہوسکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ جہاں بینکنگ کی جڑ اور بنیاد سود پر ہے وہاں انشورنس کا پہلا معاملہ جوئے پر اور دوسرا سود پر مشتمل ہے۔

اسلام کے احکام

قرآن مجید میں قمار کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اسلام ہی کیا۔ دنیا بھر کے مذاہب اور ضابطہ ہائے اخلاق نے اسے حرام کہا ہے اور اگر کسی مذہب نے اس کا جواز نکالا ہے تو وہ آسمانی مذہب نہیں کچھ اور ہوگا۔ پھر جہاں تک سود کا تعلق ہے اسے یہودیت اور عیسائیت اور اسلام تینوں مذاہب حرام کہتے ہیں۔ یہودیوں نے تحریف کی کہ یہودی سے سود لینا حرام لیکن کسی دوسرے سے لے لینا جائز ہے۔ تو آپ سب جانتے ہیں کہ خدا کا دین فرد یا ایک گروہ کے مفاد کا نہیں بلکہ پوری بنی نوع انسان اور نسلِ انسانی کے فائدے کا کام کرتا ہے اس سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ ایک ہی کام کو ایک گروہ کے لیے حلال کردے اور دوسرے کے لیے حرام — عیسائیت کے متعلق ثابت ہے کہ یہ سود کو حرام کہتا ہے اور اسلام کے بارے میں آج تک تمام اہلِ علم کا اور عام مسلمانوں کا علم رہا ہے کہ سود اپنی ہر شکل میں حرام ہے۔ قرض شخصی اغراض کے لیے ہو یا کاروبار کے لیے۔ ضرورت پورا کرنے کے لیے ہو یا بارآور کاموں کے لیے بہرحال سود سے پاک رہنا چاہیئے۔

ایک دلچسپ بحث

لیکن قریب کے زمانے میں بعض لوگوں نے یہ دلچسپ بحث پیدا کی ہے کہ شخصی حاجات کے لیے قرض لیا جائے تو وہ اور ہے اور کاروبار کے لیے لیا جائے تو اس کی نوعیت مختلف

ہوجاتی ہے لیکن قرآن مجید کی اس آیت کا مطالعہ کیا جائے جس میں سود کی حرمت کا حکم بیان کیا گیا ہے تو اس بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں ۔

(ترجمہ) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو، اور اپنا وہ سود جو باقی رہ گیا ہے، چھوڑ دو اگر تم مومن ہو ... اگر یہ نہیں کرتے تو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلانِ جنگ قبول کرو ۔ اگر توبہ کرلو تو تم کو اپنے راس المال (اصل زر) لینے کا حق ہے ۔ نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے ۔ اور اگر تمھارا قرضدار تنگ دست ہو تو اس کو مہلت دی جائے اس کی خوش حالی تک اور اگر تم صدقہ کر دو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو ۔" (سورۃ البقرہ، آیات ۲۷۸ تا ۲۸۰)

ان الفاظ سے پہلی بات یہ مترشح ہوتی ہے کہ مذکورہ سود قرض کے معاملے سے متعلق ہے اور دوسری بات " اگر توبہ کرلو تو تم کو اپنا راس المال لینے کا حق ہے" سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ قرض کے معاملے میں اصل رقم سے زائد جو کچھ بھی لیا جائے وہ سود ہے اور اسی سے توبہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے ۔

پھر اسی سورہ بقرہ کے آغاز میں (آیات ۲۷۳ تا ۲۷۵) جب لوگوں کی طرف سے کہا گیا کہ "بیع کا منافع سود کے منافع کی طرح ہے" تو جواب میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اللہ نے بیع کو حلال اور ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے یعنی بیع یا شرکت البیع میں منافع حلال اور اس کے بغیر حرام ہے ۔ محض قرض دے کر منافع لینے کا حق نہیں دیا گیا ۔ یہ اصول قرآن مجید میں واضح طور پر مقرر کر دیا گیا اور اس میں کہیں کوئی اشارہ نہیں کہ یہ ان قرضوں سے متعلق ہے جو شخصی

مفاد کے لیے لئے جاتے ہیں اور ان کے بارے میں نہیں جو تجارتی اغراض کے لیے حاصل کیے جاتے ہیں۔

بے بنیاد استدلال

کچھ لوگ استدلال کرتے ہیں کہ قرآن مجید کے الفاظ "نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے" ایک اصول مقرر کرتا ہے کہ یہ حکم صرف اس قرضے کے متعلق ہے جس میں سود کی شرح لگانے میں ظلم پایا جاتا ہو۔ لیکن اگر ان الفاظ کے سیاق پر غور کیا جائے تو یہ استدلال بالکل غلط معلوم ہوتا ہے قرآن مجید کی کسی آیت کو سمجھنے کے لیے سیاق وسباق کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے سیاق وسباق سے کاٹ کر اگر مفہوم لیا جائے تو یہ تحریف ہے تاویل نہیں۔ اور اس آیت کے سیاق سے مترشح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقروض پر ظلم یہ ہے کہ اس سے راس المال سے زیادہ لیا جائے اور قرض خواہ پر ظلم یہ ہے کہ اس کا راس المال بھی مارا جائے۔ یہ نکتہ رسی میں نہیں کر رہا ہوں بلکہ قدیم زمانے سے آج تک قرآن مجید کے مفسرین نے آیات محولۂ بالا کا مطلب یہی سمجھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر آدمی تاویل کی نیت نہ کر چکا ہو تو اس سے مختلف مطلب اخذ نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا ہے کہ قدیم زمانے سے آج تک قرآن مجید کے مفسرین اس معاملے میں میری تائید کرتے ہیں اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ، علامہ عروسی رحمۃ اللہ علیہ، شوکانی رحمۃ اللہ علیہ اور زمانۂ حال کے مفسرِ قرآن مفتی عبدہٗ رحمۃ اللہ علیہ ان میں شامل ہیں۔

ایک اور استدلال

دوسرا استدلال یہ ہے کہ عرب میں نزولِ قرآن کے وقت قرضے صرف شخصی حاجات کے لیے دیے اور لئے جاتے تھے۔ صنعتی و تجارتی اغراض اور بارآور

کاموں میں روپیہ لگانے کا رواج نہ تھا۔ چنانچہ ربوٰ جسے حرام قرار دیا گیا ہے سے مراد وہ سود ہے جو شخصی حاجات کے لیے حاصل کردہ قرض پر لگایا گیا ہو، وہ نہیں جو بار آور کاموں کے سلسلے میں لگایا جائے۔ لیکن ذرا غور کیجیے تو پہلی بات یہ سمجھ میں آتی ہے۔ کہ استدلال کرنے والوں کا خیال شاید یہ ہے کہ وہ خدا جس نے قرآن مجید میں ربوٰ کے بارے میں احکامات صادر کیے ہیں وہ نہیں جو سب کچھ دیکھتا، جانتا اور سنتا ہے، اوّل و آخر کا علم رکھتا ہے بلکہ وہ ہے (نعوذ باللہ) صرف حالات موجودہ اور عرب کے معاملات سے واقف تھا۔ نہ اسے یہ خبر تھی کہ اس سے پہلے کیا ہوتا آیا ہے اور اس کے بعد کیا ہوگا اور نہ وہ یہ جانتا تھا کہ عرب کے باہر دنیا میں کیا ہو رہا ہے ـــــ لیکن اگر وہ لوگ ایسا نہیں سمجھتے اور ربوٰ کے بارے میں احکامات اسی علیم و خبیر خدا نے صادر کیے ہیں تو اس کی طرف سے کوئی ایسا اشارہ ضرور ملنا چاہیے تھا جس کی مدد سے ہم شخصی اور کاروباری قرضوں میں فرق کر سکتے۔ لیکن نہ ایسا کوئی اشارہ کہیں ملتا ہے نہ کوئی کنایہ۔

حقیقت تو یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت دنیا میں بلکہ عرب کے آس پاس واقع ممالک میں کاروباری قرضوں کا رواج موجود تھا اور ان پر سود بھی لیا جاتا تھا۔ پھر یہ کہنا بھی غلط ہے کہ خود عرب میں یہ رواج موجود نہ تھا عرب کی تاریخ بتاتی ہے کہ عربوں کے دنیا بھر سے تجارتی تعلقات تھے۔ چین، ہندوستان، یورپ اور ایشیائے کوچک کی بیشتر تجارت عربوں کے ہاتھوں ہوتی تھی۔ عرب سے بالکل متصل ممالک بابل، شام، فلسطین، روم اور یونان میں قرآن مجید کے نزول سے ہزاروں برس پہلے سے تجارتی، صنعتی اور حکومتی قرضوں کا رواج چلا آ رہا تھا جن پر

سود لیا اور دیا جاتا تھا۔ عربوں کے ان ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات بھی تھے اور وہ تعلقات بھی جو ہمسایوں کے مابین خواہ مخواہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر عرب جن کے ہاتھوں دنیا کے ایک وسیع علاقے کی تجارت ہوتی تھی۔ لین دین رکھنے کے باعث متعلقہ ممالک کے تجارتی نظام سے خوب باخبر ہو جاتے تھے۔ ایک تجارتی راستے کا استعمال دو ہزار سات سو برس قبل مسیح سے چلا آرہا تھا جس میں عدن کی بندرگاہ سے مال وصول کر کے عقبہ پہنچایا جاتا تھا اور اس راستے پر عرب کے ایک ایک قبیلے نے کام کیا تھا۔ پھر آخر کون صاحبِ علم یہ بات مان لے گا کہ عرب اپنے زمانے کے تجارتی اور کاروباری معاملات سے بے خبر تھے۔ آگے چلنے سے پہلے اپنے بیان کی تائید میں چند حوالے پیش کرتا ہوں۔

"انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا" میں بیان کیا گیا ہے کہ بابل اور مصر کے مندر صرف عبادت گاہ نہیں بلکہ تجارتی مرکز بھی تھے۔ کسان فصل کٹنے سے پہلے مندروں سے قرضہ لیتے اور اس قرض پر سود دیتے تھے ۵۷۵ء ق م میں بابل کے ایک اگیبی نامی بینک کا سراغ بھی ملتا ہے جو تجارتی قرضے سود لے کر دیتا اور روپیہ رکھ کر اس پر سود دیتا تھا۔

"اے سٹوری آف سویلائیزیشن" میں ول ڈورانٹ نے بابل کے متعلق لکھا ہے کہ ملک میں از روئے قانون ۲۰ فیصدی سالانہ نقد روپے کے قرضوں پر اور ۳۳ فیصدی سالانہ اجناس کی صورت میں قرضوں پر سود مقرر تھا۔ بعض طاقتور خاندان نسلاً بعد نسلٍ ساہوکاری کا کام کرتے تھے یہ صنعتی کام کرنے والوں کو سود پر قرضے دیتے تھے۔ ان کے علاوہ مندروں کے پجاری فصلوں کی تیاری کے لیے زمینداروں کو قرضے دیتے تھے۔

بتاییے ان شواہد کی موجودگی میں کیسے مان لیا جائے کہ عرب کے لوگوں کو ان طریقوں کا علم نہ تھا۔ وہ تجارتی سود سے بے خبر تھے اور یہ نہ جانتے تھے کہ قرض شخصی حاجات کے علاوہ بار آور مقاصد کے لیے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چلئے مان لیا کہ قرآن مجید والا خدا صرف عرب کے حالات سے واقف تھا۔ (نعوذ باللہ) تو کیا عربوں کو بھی علم نہ تھا جن سرحدوں کے پار یہ کام ہوتے تھے۔

دور کیوں جاییے خود رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے کی بات ہے کہ قیصرِ روم نے ۶۲۳ء میں ایران کے خلاف جنگ کے دوران کلیساؤں سے سود پر روپیہ قرض لیا تھا کیا اس کے بعد بھی عربوں کو معلوم نہ ہوا ہوگا کہ حکومتیں بھی قرض لیتی ہیں اور پھر جب جنگ حنین کے موقع پر عبد اللہ بن ابی ربیعہ مخزوبی سے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے چالیس ہزار درہم قرض لیے اور جنگ سے واپسی پر یہ قرض واپس کیا تھا تو یہ بات کس سے چھپی رہ گئی کہ قرض شخصی حاجات کے علاوہ بھی کئی مقاصد کے لیے لیا جا سکتا ہے۔

پھر اس بات کے ثبوت بھی موجود ہیں کہ تجارت کے لیے قرض لینے اور دینے کا رواج بھی تھا۔ مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، علاء بن عبد الرحمٰن کے دادا کو قرض پر مال دیتے تھے کہ وہ اس سے کاروبار کریں اور منافع دونوں میں تقسیم ہوگا۔ ایک اور واقعہ یہ ملتا ہے کہ عبد اللہ رضی اللہ عنہ، اور عبید اللہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دو بیٹے فوجی خدمت کے سلسلے میں عراق گئے جب مدینہ کے لیے واپس ہونے لگے تو حضرت ابو موسےٰ اشعری گورنر بصری نے ان سے کہا کہ میں بیت المال کا کچھ روپیہ

امیرالمومنین کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں ۔ تم اس روپے سے یہاں کا کچھ مال خریدلو ۔ مدینہ جاکر بیچ دینا ۔ راس المال امیرالمومنین کو دے دینا اور نفع تمھارا رہے گا ۔ چنانچہ انھوں نے اس پر عمل کیا ۔ جب بیت المال کا روپیہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے اور ان کو بتایا کہ ہم نے اس طرح عمل کیا ہے تو حضرت عمر رضؓ نے کہا کیا ابو موسٰے رضی اللہ عنہ نے لشکر کے سارے آدمیوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا ہے ۔ انھوں نے جواب دیا نہیں ۔ فرمایا تو یہ رعایت امیرالمومنین کے بیٹوں کے ساتھ کی گئی ہے تم نے جو نفع کمایا ہے سب بیت المال میں داخل کرو ۔ اس پر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ تو خاموش رہے ، عبیداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ۔ امیرالمومنین آپ کو ایسا نہ کرنا چاہئے ، اگر بیت المال کے روپے کا کچھ نقصان ہوتا تو ہم ذمہ دار تھے ۔ پورا مال ادا کرتے ۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بات پر اصرار کیا ۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے عرض کیا کہ امیرالمومنین آپ اسے "قُراض" (آئینی شرکت جس میں ایک کا روپیہ اور دوسرے کی محنت ہو) قرار دیتے تو اچھا تھا ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اچھا میں اسے قراض قرار دیتا ہوں ۔ آدھا نفع بیت المال میں داخل کرو اور آدھا تم رکھو ۔ غرض یہ بات بالکل غلط ثابت ہوتی ہے کہ عرب میں قرض صرف شخصی حاجات کے لیے چلتا تھا ۔ ہمیں ماننا چاہئے کہ وہ معاملہ جس میں راس المال سے کچھ زیادہ دیا جائے سود ہے ۔ خواہ وہ کسی غرض کے لیے ہو اور سود کو قرآن مجید میں حرام قرار دیا گیا ہے ۔

مُتبادل تجاویز

اپنی تقریر کے پہلے دو اجزا سے گزر کر اب میں اس آخری حصّے میں پہنچ گیا ہوں جس میں مجھے یہ بتانا ہے کہ بینکنگ اور انشورنس کے موجودہ طریقوں کو ترک کر کے

اسلامی طریقہ کیا اختیار کیا جائے گا ۔

اس وقت انڈونیشیا سے مراکش تک متعدد آزاد مسلم مملکتیں قایم ہیں ان کے پاس ذرائع ووسائل کی کمی نہیں ۔ بالخصوص مشرقِ وسطیٰ کی سیال دولت کا تو شمار ہی نہیں ۔ دوسرے مسلم ممالک بھی دولت سے تہی دامن نہیں کہے جا سکتے اگر یہ سب ممالک متفق ہو کر ایک مالی نظام اپنے اصولوں پر قائم کریں تو یہ نہ صرف قابلِ عمل ہے بلکہ ہمارے بے شمار مسائل کا واحد حل بھی بن سکتا ہے پھر بینکنگ کے نظام کو سود پر چلانے کے بجائے نفع کی بنیاد (PROFIT & LOSS SHARING RATIO) پر کامیابی سے چلایا جاسکتا ہے ۔

اصل میں یہ مفروضہ ہی بجائے خود غلط ہے کہ سود بینکنگ کی بنیاد ہے حالانکہ اگر سود کی لالچ دیئے بغیر ساہوکار (BANKERS) لوگوں کو بچتیں (SAVINGS) یہ کہہ کر کر لیں کہ تم لوگ خود ایک صنعت یا تجارت کو چلانے کی ہمت نہیں رکھتے تو لاؤ یہ کام ہم کرتے ہیں اور منافع ایک نسبت سے تمہیں ادا کر دیں گے اور روپیہ اس طرح جمع کر کے ساہوکار جب اسے کاروبار میں لگانے کے لیے آگے چلائے تو وہاں بھی سود پر معاملہ طے کرنے کے بجائے کاروبار کے منافع میں سے ایک حصہ وصول کر لے ۔ منافع کی اس بنیاد پر ہماری معیشت اسی خوبی سے کھڑی ہو جائے گی ۔ جس خوبی سے سود کی بنیاد پر کھڑی ہو سکتی ہے بلکہ اوّل الذکر کو اگر اپنایا جائے تو خیر و برکت کی اور بھی بہت سی صورتیں نکل آتی ہیں ۔ اس کے نتیجے میں بچت کرنے والے کو، بینک کو اور پورے معاشرے کو یکساں فائدہ پہنچتا ہے ۔ موجودہ سودی نظام میں ان لوگوں کے لیے جو بار آور PRODUCTIVE کاموں کے لیے روپیہ قرض لیتے ہیں ۔ منافع کی کوئی گارنٹی نہیں لیکن روپیہ قرض دینے والا سرمایہ دار اپنے منافع کی شرح کی ضمانت لے لیتا

ہے ۔ آخر کون سی معقول وجہ ہے اس بات کی کہ سرمایہ دار کے لیے تو منافع اور ایک خاص منافع کی گارنٹی ہو لیکن کسی اور کے لیے نہ ہو ۔ جو لوگ کام کرتے ہیں وہ نفع میں رہیں یا نقصان میں سرمایہ دار بہرحال اپنا منافع وصول کرلے لیکن اگر اس نظام کو منافع کی تقسیم پر چلایا جائے تو ایک طرف یہ بے انصافی ختم ہو جائے گی اور دوسری طرف صنعت و تجارت کو بھی کہیں زیادہ فروغ حاصل ہو گا ۔ کاروبار سے اگر سرمایہ دار کا مفاد وابستہ ہو تو وہ ہر اس موقع پر اپنی تجوری کا منہ کھول دے گا جب کاروبار روپے کی ضرورت محسوس کرے پھر وہ سال کے سال اپنا منافع وصول کر لینے کے بجائے کاروبار کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا موقع دے گا ۔ حالانکہ سود کے معاملے میں اس کا رویہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے ، وہ کاروبار کی حالت پر غور کیے بغیر آغاز ہی میں اپنا منافع وصول کرنا شروع کر دیتا ہے اور اگر کاروبار سرمایہ کی ضرورت کے کسی نازک مرحلے میں پہنچ گیا ہو تو بجائے فراخدلی سے روپیہ لگانے کے منافع کی شرح بڑھا کر اور اپنی خاص شرائط منوا کر سرمایہ دیتا ہے ۔

رہا سوال اس قرض کا جو حکومت کو ایسے کاموں کے لیے دیا جاتا ہے جن میں ملک کا بھلا ہو تو اس کی موجودہ صورت یہ ہے کہ سرمایہ دار روپیہ دے کر سود وصول کرتا اور بہرحال نفع میں رہتا ہے ۔ لیکن غریب آدمی کو اُلٹا نقصان یہ پہنچتا ہے کہ سود کی رقم ٹیکسوں کی شکل میں اسی سے وصول کی جاتی ہے حکومت اس روپے سے اگر دفاع کا کام کرتی ہے تو اس صورت میں بھی اور سب لوگ تو خطرہ مول لیتے ہیں ، اپنی جانیں تک دے ڈالتے ہیں ، لیکن سرمایہ دار سے جو قرض لیا گیا ہے اس کی گارنٹی بہرحال موجود ہے ، اسے برسہا برس اپنی اصل پر سود ملتا رہے گا ۔ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ انصاف سے بعید

ہے ۔ لہذا متبادل نظام میں حکومت اپنے قرضوں پر سود ادا نہیں کرے گی۔ ہنگامی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اسے ملک میں موجودہ سرمائے کو استعمال کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اور اس سرمائے کا منافع کسی خاص طبقے کو نہیں بلکہ ملک کی بہبود کی صورت میں سب کو یکساں ملے گا۔

غرض بینکنگ کی یہ متبادل شکل بہرصورت قابل عمل ہے ۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ لوگ سہولت پسندی کی بنا پر موجودہ حرام طریقے ہی کو حلال کر لینا چاہتے ہیں تاکہ اس طریقے کی تلاش و جستجو میں محنت نہ کرنی پڑے جو واقعی حلال ہے ۔ ان سے کوئی اتنی ہی بات پوچھ لے کہ کمیونزم جیسے انتہا پسند نظریہ کو ایک شخص لے کر اٹھ سکتا ہے تو ہم ایک معتدل ، مفید اور باعثِ خیر و برکت طریقۂ کار کو لے کر کیوں نہیں اٹھ سکتے ایک غلط بات کو لوگ درست بنا کر پیش کر سکتے ہیں تو ایک درست بات کو پیش کرنے میں ہم کیوں جھجکتے ہیں ؟

انشورنس کا متبادل نظام

جہاں تک انشورنس کے مقصد کا تعلق ہے اس کی صحت سے ہمیں انکار نہیں یہ درست ہے کہ اگر حادثات میں غیر معمولی نقصانات پہنچیں تو ان کی تلافی کا ایک طریقہ ضرور موجود ہونا چاہیے لیکن ضروری نہیں کہ وہی طریقہ اختیار کیا جائے جس کی بنیاد قمار پر ہو ۔ انشورنس کو اسلامی اصولوں کے مطابق اس طرح مرتب کیا جا سکتا ہے کہ ایسے اداروں کی تشکیل کی جائے جن میں شریک ہر فرد اس غرض سے ایک خاص رقم مسلسل ادا کرتا چلا جائے کہ اگر اسے یا اس کے کسی ساتھی کو کچھ نقصان ہوا تو پورا کر دیا جائے گا۔ پھر جس کسی کو نقصان پہنچے وہ فائدہ اٹھائے اور جسے نقصان نہ ہو وہ اپنی ادا شدہ رقم کی واپسی کی امید نہ رکھے ۔

یوں انشورنس قمار سے بالکل پاک ہو جاتا ہے پھر اسے سود سے بچانے

کے لیے محفوظ سرمائے کو موجودہ سودی طریقوں پر چلانے کے بجائے تجارت کے ذریعے نشوونما پذیر سرمائے کی شکل دی جاسکتی ہے مجھے یقین ہے کہ انشورنس کے اس طریقے کو رائج کیا جائے تو دنیا اس کی نقل کرے گی۔ ہم ان معاملات کو زیادہ صالح اور زیادہ مضبوط بنیادوں پر چلا کر دکھائیں تو دنیا والے اتنے بیوقوف نہیں ہوں گے کہ ہماری پیروی نہ کریں۔

حرفِ آخر

آخر میں مَیں ان لوگوں سے اپیل کرتا ہوں جو ان معاملات کا فہم رکھتے ہیں کہ وہ موجودہ طریقوں کا جواز ثابت کرنے کے لیے اسلامی احکام میں ترمیم و تحریف اور تاویل سے باز آجائیں۔ کرنے کا کام فی الحقیقت یہ ہے کہ اسلامی اصولوں کے مطابق ایک نئے نظام کو اپنے ہاں نافذ کرنے کے لیے تحقیق، جستجو اور محنت کی جائے۔ یہاں ایک بات عرض کر دوں۔ مشرقِ وسطیٰ کے دورے میں میری ملاقات سعودی عرب کے ایک ماہرِ مالیات سے ہوئی تھی میں نے ان کے سامنے نئے نظام کے انہی خطوط کو پیش کیا جو آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں تو انھوں نے رائے ظاہر کی کہ یہ فی الواقع کرنے کا کام ہے بہت کامیابی سے کیا جاسکتا ہے اور اس سے انتہائی خوشگوار نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

اپنے ہاں اگر ہم اصلاح کا ارادہ کرلیں تو اوّلین ضرورت اس بات کی ہوگی کہ سود کی حرمت کا حکم نافذ کر دیا جائے اس کے بغیر نیا طریقۂ کار کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا چند سالوں کے بعد تو لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ سود کی نسبت منافع کی تقسیم کا معاملہ زیادہ فائدہ دینے والا ہے لیکن یہ حالات موجودہ سود کے "فوائد" سے دست بردار ہونے پر تیار نہ ہوں گے یعنی جب تک حرام کا راستہ بند نہ کیا جائے لوگ حلال کے راستے کو اختیار نہ کریں گے۔ اور اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ اگر گاڑی میں بلا ٹکٹ سفر کرنا جرم نہ ہو تو ٹکٹ خریدنے

کی زحمت کوئی بھی نہ اٹھائے گا۔ اپنے ہاں سودی کاروبار کو ممنوع قرار دے کر ہم نئے نظام کی داغ بیل ڈال سکتے ہیں۔ لیکن بین الاقوامی سطح پر شاید چند سال اور ہمیں اس لعنت کو برداشت کرنا پڑے۔ یہ فی الحقیقت ایک عبوری دور ہوگا اور اس وقت ختم ہو جائے گا جب کہ ہم مالی معاملات میں خود کفیل ہو جائیں گے یا دنیا ہمارے نئے نظام کی قائل ہو کر ہمیں از خود سود کی قید سے آزاد کر دے گی اور یقین رکھیے کہ یہ وقت آنے میں بہت زیادہ دیر نہ لگائے گا۔

زیرِ نظر کتابچہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ایک تقریر پر مشتمل ہے جسے مولانا نے عام اجتماع میں پیش کیا تھا۔ خیال تھا کہ اس لیکچر کو لکھ کر مولانا مودودی کو دکھا لیا جائے گا لیکن مولانا اپنی علالت کے باعث اس کے لیے وقت نہ دے سکے۔ تاہم کوشش کی گئی ہے کہ مولانا کی کہی ہوئی باتوں سے کوئی ایک بات بھی رہ نہ جائے۔ اور جہاں تک ممکن ہو الفاظ بھی وہی رکھے جائیں جو مولانا نے ادا کیے۔ مرتّب کو یقین ہے کہ مولانا کے لیکچر کا پورا مفہوم اس تحریر میں آگیا ہے۔